حکیم حبیب اشعر (مرحوم)

"شعاعِ ثاقب"

یہ مضمون درحقیقت جناب آغا ثاقب سلیمانی کے مجموعۂ شعری "شعاعِ ثاقب" کا تعارف ہے، جو مشہور ادیب حکیم حبیب اشعر مرحوم نے جون ۱۹۷۰ء میں لکھا تھا۔ یہ مجموعۂ کلام اور تعارف ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس تعارف کی حیثیت چوں کہ اردو شاعری کی ایک مختصر تاریخ کی ہے، اس لیے اُسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ تعارف آغا ثاقب سلیمانی نے عنایت کیا ہے۔ (ادارہ)

اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز محمد شاہ رنگیلے کے عہدِ حکومت میں ہوا۔ یہ زمانہ سیاسی افراتفری کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر غازی کی وفات کے بعد مغلیہ اقتدار "شمشیر و سنان" سے گزر کر "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ خاندانِ شاہی کی باہمی رقابتوں اور امرائے دربار کی جاہ پسندیوں نے سلطنت کے استحکام میں رخنے ڈال لیے تھے جو داخلی خرابیوں، بیرونی حملوں، غیر ملکی تاجروں کی دسیسہ کاریاں اور سلطنت دشمن مسلح بغاوتوں کے تسلسل سے شگاف بنتے جا رہے تھے۔ رہی سہی کسر نادر شاہی حملے نے پوری کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں مرکز کو جس تباہی سے دوچار ہونا پڑا، اس نے حکمرانِ قوم کی معاشی اور اقتصادی اخلاقی اور مجلسی زندگی کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے۔

ایک طرف سیاسی و اخلاقی بدحالی کا یہ عمل جاری تھا۔ دوسری طرف اردو شاعری جس فارسی شاعری کے سائے میں پروان چڑھ رہی تھی وہ خود اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ کر انحطاط و نساد کی طرف تیزی سے قدم زن تھی۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جن بزرگوں نے اُردو شاعری کا ہاتھ پکڑا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ذہنی طور پر ماحول سے شکست قبول کر چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری تخلیقی قوتوں کا مظہر ہونے کی بجائے محض فارسی شاعری کی نقالی بن کر رہ گئی۔ دو یا چار استادانِ فن کو چھوڑ کر اس دَور کے ہر شاعر کے کلام میں خیال بندی، رعایتِ لفظی، تمثیل نگاری اور صنعت گری کی ریل پیل اسی خارجی ماحول اور ذہنی تکان کا عکس ہے۔

اردو شاعری کی یہ فضا محمد شاہ کے دور سے لے کر شاہ عالم کے دَور تک قائم رہی۔ اگر آپ اس زمانے

کے ہر چھوٹے بڑے شاعر کا ذہنی تجزیہ کریں تو ایک بات ان سب میں مشترک ملے گی اور وہ ہے زندگی سے فرار اور اس کے حقائق سے گریز۔ فرق صرف اتنا ہے کہ چھوٹے اور اوسط درجے کے شاعر رامش و رنگ اور مے و معشوق میں گم ہو گئے اور بلند پایہ فن کاروں نے واقعات کی سنگینی سے گھبرا کر یا اکتا کر "درون بینی" کو اپنے فکر و فن کا موضوع بنا لیا۔ راستے مختلف تھے لیکن منزل سب کی ایک تھی۔

شاہ عالم کے دورِ فرماں روائی میں جب دلی فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنی اور اہلِ کمال کے لیے دلی میں رہنا دوبھر ہو گیا، تو وہ تلاشِ معاش میں اپنے وطن سے نکلے اور ان کی اکثریت نے لکھنؤ کا رُخ کیا جہاں امن و سکون بھی تھا، معاشی آسودگی بھی تھی اور ہنر و کمال کی قدر دانی بھی تھی۔ یہاں پہنچ کر اُردو شاعری نے ایک نیا چولا بدلا۔ جس طرح معنوی غذا جزوِ بدن بننے کے لیے طاقت ور آلاتِ ہضم کی طلب گار ہوتی ہے اسی طرح دولت و فراغت اپنے نیک ثمرات کے لیے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار چاہتی ہے۔ لکھنؤ میں روپے پیسے اور آرام و آسائش کی بے شک فراوانی تھی، لیکن اخلاقی فساد کے جو جراثیم پورے برصغیر کے رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے، وہ یہاں بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ کارفرما تھے اس لیے لکھنوی معاشرہ دولت و آسودگی کے بل پر "غمِ روزگار" سے بے نیاز ہو کر سر تا پا ہوا و ہوس کے سمندر میں غرق ہو گیا اور اردو شاعری لفظوں کا ایک لایعنی گورکھ دھندا اور عیش کوشی و بوالہوسی کا ایک دفترِ بے معنی بن کر رہ گئی۔

یہی لیل و نہار تھے کہ ۱۸۵۷ء میں برطانوی استعمار کے خلاف، جو اپنے چھل فریب، دھونس اور دھاندلی کے سہارے برصغیر میں پنجے گاڑتے گاڑتے دلی تک پہنچ گیا تھا، مسلح جدوجہد ہوئی اور اس میں ناکامی کے بعد برصغیر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب یہ ملک براہِ راست تاجِ برطانیہ کے سائے میں آگیا۔ مغربی اقتدار اپنے ساتھ مغربی افکار بھی لایا اور یہ افکار آہستہ آہستہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کرتے گئے۔

اردو شاعری میں یہ مغربی اثر مولانا حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کی اشاعت کے بعد شروع ہوا۔ مولانا حالی نے لاہور میں شمس العلما محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر نئی شاعری کی بنیاد رکھی۔ لاہور کے ان مشاعروں میں مصرع طرح کی بجائے کوئی عنوان تجویز کیا جاتا اور اس عنوان پر نئی نسل کے شعرا نظمیں کہہ کر پڑھتے۔ اس طرح گویا جدید شاعری کی روایت قائم ہوئی اور پنجاب کے شعرا نے اس میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ حکیم الامت علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، پروفیسر تاثیر اور مولانا ظفر علی خاں اپنے اپنے دائرے میں ان نئے رجحانات کو قبول کرنے اور انھیں پھیلانے میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک اور شاعر کا نام میں نے جان بوجھ کر نہیں لیا۔ یہ جواں مرگ اختر شیرانی ہیں۔ اختر شیرانی رہنے والے تو ریاست ٹونک (بھارت) کے تھے لیکن تعلیم و تربیت انھوں نے لاہور میں پائی تھی۔ اس لیے ان کا شمار بھی پنجاب کے شعرا میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ یہ بھی جدید شاعر ہیں لیکن ان کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری کے روایتی محبوب کو اپنی شاعری سے خارج کر دیا اور "سلمٰی" کو اپنے عشق و عاشقی اور شعر و شاعری کا موضوع بنایا۔ سلمٰی واقعی کوئی جیتی جاگتی شخصیت تھی یا اختر شیرانی کی فرضی اور خیالی محبوبہ! اس سے مجھے بحث نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختر شیرانی نے محض جدید شاعری کی پیروی ہی نہیں کی بلکہ ایک نئی روایت کی طرح ڈال کر اُردو شاعری میں اضافہ کیا۔

اختر شیرانی کی اس "بدعت" کو رومان پسند نوجوان شعرا نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے معتقدین و متبعین کا ایک اچھا خاصا گروہ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اختر شیرانی کی انفرادیت آج بھی قائم و برقرار ہے اور ان کے پیروؤں میں سے ایک بھی ان کا سا خلوص اور ان کا سا آہنگ پیدا نہ کر سکا۔

آغا ثاقب سلیمانی جن کے کلام سے تعارف کی خاطر یہ سطریں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔ اختر شیرانی ہی کے مکتبِ شعر و ادب کے۔ اگر آپ اسے مکتبِ شعر و ادب کہنا قبول فرمائیں ــــ ایک خوش فکر رکن ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ثاقب سلیمانی کے حالات اور خاندان پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ فن کار اپنے عنفوانِ [illegible] ہی سے اپنے گلستانِ سخن کی آبیاری کرتا ہے۔

ثاقب صاحب کا نام آغا عبدالواسع ہے۔ ثاقب تخلص اور سلیمانی نسبت ہے۔ یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو [illegible] (ضلع جھنگ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول چنیوٹ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج [illegible] سے ایف اے اور ڈی مونٹ مورنسی کالج شاہ پور صدر سے بی اے پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ آج کل محکمہ آبکاری و محصولات سے منسلک ہیں اور اکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر کے منصب پر فائز ہیں۔

آغا ثاقب صاحب کے آبا و اجداد سہارن پور سے نقلِ وطن کر کے چنیوٹ پہنچے [illegible] ان کے والد بابو عبدالعزیز صاحب فارسی کے خوش فکر شاعر تھے [illegible] ان کے دادا [illegible] صاحب [illegible] تخلص کرتے تھے۔ اردو کا ایک مکمل دیوان ان سے یادگار [illegible] ثاقب صاحب [illegible] ہیں اور یہ ذوق ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔

ثاقب سلیمانی صاحب شروع شروع حضرت خیالی مراد آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے [illegible]

پھر کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں کیا لیا پسند فلسفی حکیم ہی کو دیا جاتا۔ نوجوانی کا تقاضا ذہنی طبیعت میں رومان اور جذبات میں ہیجان اور خیز رنگ کا حامل تھا۔ اس دور کی بے چینی لفظوں پر چھایا ہوا تھا۔ جبھی انھیں کے ہم نوا ہوگئے اختر مرحوم انھیں "شاعرِ جوانی" کہا کرتے تھے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ سفر کی تعلیم اور پاکیزہ ماحول تھوڑی سی مشق بھی سے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا۔ شاعری سے اپنا حق وصول کر چکے تو فنونِ لطیفہ کی دوسری اصناف کی طرف مائل ہوئے۔ اور مصوری، خطاطی اور ناخن نگاری وغیرہ میں درک حاصل کیا۔ اس سے آگے بڑھے تو نجوم و جفر ان کے علمی تفریحات میں تھے۔ زمین سے ستاروں تک پہنچے تھے۔ ستاروں سے زمین و آسمان کے خالق کی طرف رخ کیا اور آج تک اس عافیت ہی کے حصارِ عافیت میں آسودہ ہیں۔

ثاقب صاحب کے کلام پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک توضیح ضروری ہے۔ عام طور پر شاعروں کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ وہبی اور اکتسابی۔ وہبی وہ شاعر ہے جسے شعر گوئی فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہو اور اکتسابی وہ شاعر ہے جس نے یہ فن اپنی کوشش اور شوق سے حاصل کیا ہو۔ مجھے اس تقسیم سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک ہر شاعر خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، بیک وقت وہبی بھی ہوتا ہے اور اکتسابی بھی یعنی شاعری کا شوق اور اس کی صلاحیت اسے فطرت کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اور اس میں کمال و امتیاز وہ اکتساب سے حاصل کرتا ہے۔ فطرت کا انعام یہ ہے کہ وہ اسے طبعِ موزوں اور ذوقِ سلیم سے نوازے اور اکتساب کا فیضان یہ ہے کہ وہ اس کے جوہر میں حسن اور نکھار پیدا کر دے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہیرے میں چمک فطرت کا عطیہ ہے اور اسے تراش کر اس چمک کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا اس کے تراشنے والے کا کمال ہے۔ میں نے کوئی شاعر نہیں دیکھا جس نے محض اپنی فطری قوتوں کے بل پر فضا اور ماحول سے کچھ حاصل کیے بغیر اپنے فن کو ہنر بنا لیا ہو۔ مرزا نوشہ بھی یونہی آگرہ اکبر سے غالب نہ بنے تھے۔

ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ شاعر ہوتے تو دو ہی قسم کے ہیں۔ مگر انھیں وہبی اور اکتسابی کا نام دینے کی بجائے صرف "فنکار" اور "نقش نگار" کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے۔ فنکار میرے نزدیک وہ ہے جس کی زندگی کا ہر کوئی لمحہ اس کا فن ہو جاتا ہے تمام تر الفاظ و خیال خلاقی حیثیت کے ہوں اور نقش نگار وہ ہیں جو صرف لکھنے کا ہنر جانتے ہیں کسی ذہنی تجربے کے طور پر یا اُسے کسی ہنگامی کیفیت کے تحت شعر بنانے کی موزوں الفاظ کے ہوتے ہوئے تو مسلط ہو لینے دے۔

اگر میری اس توضیح سے اتفاق کر لیا جائے تو میں ثاقب صاحب کو شعرا کے دوسرے زمرے یعنی

"تفنّنِ کاردوں" میں رکھوں گا۔ نوجوانی کے تشنہ و ناآسودہ جذبات نے گوشت پوست کے اس جیتے جاگتے پیکر کو اپنا مقصود ٹھہرایا۔ شوق کا قافلہ اس کی طرف بڑھا۔ شاعری نے بانگِ درا کا کام دیا۔ اور جب مسافر اپنی منزل پر پہنچ گیا تو یہ بانگ درا بھی خاموش ہوگئی۔

آیئے! اب ثاقب صاحب کے کلام میں شوق کے اس سفر کا عکس دیکھیں۔

عمر کے قدم لڑکپن کی حدود سے گزر کر جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوگئے ہیں۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ خون رگوں میں چٹکیاں لینے لگا ہے۔ خیالات کی معصومی میں شکن سی پڑگئی ہے اور فکر کی سادگی میں گرہیں سی لگنی شروع ہوگئی ہیں۔ لڑکپن کی امنگیں ایک مبہم سے جنسی مطالبے کی صورت اختیار کرگئی ہیں اور سہانے خوابوں کے ایک رنگا رنگ حلقے نے سارے وجودِ معنوی کو گھیر لیا ہے۔ کتنے حسین اور نظر فریب ہیں یہ خواب، کائنات سے زیادہ پُراسرار اور جنت سے زیادہ روح پرور۔ لیکن خواب دیکھنا تو ذہن کا کام ہے، جسم اس کی تعبیر چاہتا ہے۔ خواب اگر خواب ہی رہیں، تو محرومی کا احساس شدید ہوجاتا ہے۔ پیاس تونس بن جاتی ہے۔ مگر یہ تو خواب پر خواب ہی چلے آرہے ہیں۔ ان کا تسلسل کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے، فطرت انھیں شرمندۂ تعبیر دیکھنا ہی نہیں چاہتی:

جوانی ماحصل ہے چند روزہ زندگانی کا   مگر شرمندۂ تعبیر یہ خوابِ حسیں کیوں ہو

یہ مایوسی یا جھنجھلاہٹ جو کچھ سمجھیے نتیجہ ہے شوق کی بے قراری اور شاعر کے عصبی ہیجان کا۔ ورنہ جوانی کا خواب۔ خواب بے تعبیر نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ تصوّر ہے، جو تصویر بنانے سے پہلے مصوّر کے ذہن میں کلبلاتا رہتا ہے اور جب تک تخلیق کا عمل مکمل نہ ہوجائے، اس کے فکر و خیال پر چھایا رہتا ہے۔ چنانچہ آغا صاحب کو جوانی کے اس خواب کی تعبیر ملی اور اس شان سے ملی کہ ثاقب صاحب کو بے اختیار کہنا پڑا:

روشن ہے جس کے نور سے قندیلِ زندگی   آنکھوں میں ہوں وہ گوہرِ تاباں لیے ہوئے

پھر جا رہا ہوں منزلِ جاناں کی سمت میں   سینے میں اپنے جوششِ طوفاں لیے ہوئے

منزلِ جاناں میں پہنچ کر سب سے پہلے ہدیۂ دل پیش کرنے کی اجازت طلب کی جارہی ہے:

قبولِ حُسن سے حُسنِ قبول حاصل ہو   تو میں یہ اپنا دلِ بے قرار نذر کروں

اور جب لبِ ناز جنبش میں آئے تو عالمِ وجود کچھ سے کچھ ہوگیا:

ترے لبوں کا طلسمِ سکوت کیا ٹوٹا   عدم کو خوابِ عدم سے جگا دیا تو نے

اب معاملاتِ عشق کی مختلف جھلکیاں ملاحظہ کیجیے:

نگاہِ ناز کو شرمندۂ جواب نہ کر — مرے شریر لبوں پر سوال رہنے دے
جو تیرے طاقِ ابرو میں کبھی ہیں نے قضا کی تھیں — زباں پر سے ابھی تک وہ مناجاتیں نہیں جاتیں

تیری رنگین ادا نظر کے سوا — بزم میں کوئی ہوشیار نہیں
بے خودی ہے کہ چھائے جاتی ہے — مے بہ اندازہ خمار نہیں

چھلکتی ہے مینا سے رنگیں گلابی — مگر ہم تو دستِ کرم دیکھتے ہیں
وہ کھوئے ہیں خوابوں کی جنت میں ثاقب — مگر ہم ورائے ارم دیکھتے ہیں

پھر آج صبحِ درخشاں کا انتظار کریں — قبائے غنچۂ رنگیں کو تار تار کریں
چمن میں پھول کھلائیں ہم اپنے نغموں کے — خوشی میں رقص کریں، اور بار بار کریں
گزر گیا جو یہ موسم تو پھر نہ آئے گا — شرابِ حسن کو آلودۂ خمار کریں
عروسِ لالہ جو گرمِ سخن ہو، ہم نہ سنیں — نگاہِ گل جو اٹھے ہم پہ شرمسار کریں
دلوں میں جوت لگادے جو مہر و الفت کی — سرودِ نغمہ سے پیدا وہی شرار کریں

مے کی حرمت کا میں بھی قائل ہوں — تو نہ ہو ساقی تو پھر حرام نہیں
ہو رہی ہے تری جبیں سے طلوع — صبحِ رنگیں کہ جس کی شام نہیں

بالآخر شوقِ بے تاب اصل مدعا زبان پر لے ہی آتا ہے:

حشر زا ہیں پہلو میں شورشیں گناہوں کی — ان جواں امنگوں کا آج خوں بہا بھی دو

پذیرائی و سپردگی کے بعض مرحلوں کی عکاسی دیکھیے:

مری حریص نگاہوں کو کامیاب نہ کر — تو اپنے دل میں مرا جذب باریاب نہ کر
چرا لیا ہے جو بھولے سے تیرا بوسۂ لب — تو میری جرأتِ رنگیں پہ تو عتاب نہ کر
بہار بیتنے والی ہے جوش پر ہے جنوں — بہار بیت ہی جائے گی احتساب نہ کر

حیاتِ شوق میں کامیابی و کامرانی کے پہلو بہ پہلو ہجر و محرومی کی ہنگامی ساعتیں بھی آتی ہیں۔ ثاقب صاحب کو بھی ان ساعتوں سے واسطہ پڑا ہے:

آج پہلو میں وہ نگار نہیں — جانِ بے تاب کو قرار نہیں

خودی کا حسن تو پھر بحال رہنے دے — نہ چھیڑ مجھ کو کسی کا خیال رہنے دے

کون پہلو سے اٹھ گیا ثاقب — آنکھ پُرنم ہے دل میں جوش نہیں

دل میں اک حسرتِ بےتاب لیے جاتا ہوں — آج میں دیدۂ بےخواب لیے جاتا ہوں

اپنی بھیگی ہوئی پلکوں پہ یہ اشکِ حسرت — جانِ انجم دُرِ خوش آب لیے جاتا ہوں

چشمِ ماضی کے حسیں سپنوں کی فردوس لیے — بھولے بسرے ہوئے کچھ خواب لیے جاتا ہوں

آج وہ ماہ و گل عذار نہیں — چاندنی ہے مگر بہار نہیں

کتنی بےکیف ہیں مری راتیں — بادہ میں عکسِ روئے یار نہیں

دل پہ اک بےخودی سی طاری ہے — سایۂ زلف مشک بار نہیں

ہر کلی ہے چمن میں افسردہ — ایک میں ہی تو سوگوار نہیں

گونجتی ہے فضا میں خاموشی — روح میں کوئی نغمہ بار نہیں

صبحِ غم کا ابھی سویرا ہے — ہجر میں شامِ انتظار نہیں

سویا ہوا ہے سبزہ تو کلیاں اداس ہیں — تم اس چمن سے مثلِ نسیمِ سحر گئے

اشکوں کی زبانی جو تاروں سے کہا جائے — اس درد بھرے دل کے افسانے کو کیا کہیے

خوں دیدہ حسرتوں میں وہ امید کی جھلک — کچھ ٹمٹما رہی ہے یہ شمعِ مزار ابھی

مری افسردہ تمناؤں کی خاکستر میں — اب تلک ایک سلگتی ہوئی چنگاری ہے

غرض شوق کا قافلہ اسی طرح رواں دواں رہا۔ کہیں کامرانی کے سلسلے تھے کہیں محرومی کے چٹیل میدان، کہیں وصل و قرب کے نخلستان تھے، کہیں ہجر و بُعد کے ریگ زار۔ بالآخر مختلف نشیب و فراز سے گزر کر وہ مقام بھی آ ہی گیا جہاں دو بےتاب روحوں کا سفر ختم ہونا تھا، جہاں حُسن و عشق کو چھاؤنی چھانی تھی:

شبِ وصال کی شیریں صباحتوں کی قسم — ریاضِ خلد کی حوروں پہ اعتبار ہے آج

فضا میں حسن و نزاکت سے محو یا کبھی — سرورِ نور کی پریوں کی اک قطار ہے آج

ان رس بھرے ہونٹوں کی وہ شاداب لطافت — میرے نفسِ گرم سے کملا نہ سکے گی

جب جذبے کی پتوار ہی نہ رہی، تو شاعری کا سفینہ کیسے رواں رہتا۔ وہ بھی ساحلِ سکوں پر لنگر انداز ہو گیا۔

اب تو کوئی ایسی ہی تند و تیز موج اٹھتی ہے تو اس سفینے میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ حرکت اور رفتار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ثاقب صاحب کی شاعری کا یہ جائزہ ان کے ذہنی اور جذباتی پس منظر میں لیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے ظاہری پہلوؤں اور صوری محاسن کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا۔ یہ کام قارئینِ ادب خود بھی کر سکتے ہیں میرے نزدیک تو اصل چیز فن کار کی شخصیت کو اس کے فن سے سمجھنے کی کوشش کرنا ہے اور یہی اصول میں ان شاعروں اور ادیبوں پر بھی منطبق کرتا ہوں جنھیں میں نے اوپر "تفنن کار" کہا ہے۔

یوں ثاقب صاحب کی تعلیم، ان کی تربیت، ان کا ماحول اور سب سے بڑا وہ دور جس میں انھوں نے اپنی "فکر" کو "نوا" کے سانچے میں ڈھالا ہے، یہ سب کے سب ان کی شاعری کے ظاہری پہلوؤں کی خوبی و بہتری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

انڈونیشیا

از شاہد حسین رزاقی

"..... شاہد حسین رزاقی نے انڈونیشیا کے متعلق ایک جامع، مفصل اور مستند کتاب لکھ کر ایک اہم ضرورت ہی پوری نہیں کی بلکہ ملک کے اربابِ علم کو ایک نیا راستہ بھی دکھلایا ہے۔ انھوں نے غیر معمولی کاوش اور عرق ریزی سے کام لے کر اور انڈونیشیا کے ممتاز رہنماؤں سے براہِ راست معلومات حاصل کر کے ایک ایسی کتاب پیش کی ہے جسے بجا طور پر اردو کی مطبوعات میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے اور دل میں بے ساختہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ایسی ہی کتاب پاکستان کے متعلق بھی تصنیف کی جاتی۔ تاریخِ عالم اور عصری سیاسیات کے ہر طالبِ علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

صفحات ۴۶۴ قیمت ۱۵/۰۰ روپے

ملنے کا پتا:- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور